مولوی تراب علی لکھنوی

مسعود انور علوی کاکوروی

تاریخ و تذکرہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں تقریباً ہر جگہ ایسی متعدد شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں جن کے ناموں کی یکسانیت کی بنا پر اکثر سوانح نگار بھی مغالطہ میں پڑ جاتے ہیں۔ بارہویں، تیرہویں صدی ہجری میں اودھ میں بھی تین مختلف جگہوں پر ایک ہی نام کی تین اہم شخصیتیں پیدا ہوئیں، میری مراد حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکوروی (۱۱۸۱ھ/۱۷۶۸ءتا ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء) ایک متبحر عالم، صاحبِ طرز ادیب و انشاء داز، بلند پایہ صاحبِ دیوان شاعر اور جلیل القدر عارف و صوفی، مولانا تراب علی خیرآبادی (۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء) ایک ماہر لسانیات علم صرف و نحو کے امام اور مولانا تراب علی لکھنوی (۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء تا ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء) ایک مقتدر عالم اور ماہر معقولات و منقولات سے ہے۔ ذیل میں آخرالذکر کا ایک سوانحی تعارف مع ان کی تصانیف کے تذکرہ کے درج ہے۔

نام و نسب

پورا نام تراب علی بن شیخ شجاعت علی ہے۔ سلسلۂ نسب حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہما تک اس طرح پہنچتا ہے (۱) شیخ شجاعت علی (۲) مفتی فقیہ الدین (۳) محمد دولت (۴) مفتی رکن الدین ابوالبرکات دہلوی ثم لکھنوی (۵) جمال الدین (۶) نصیر الدین (۷) شیخ سماء الدین (۸) فخرالدین

(۹) [illegible] تحصیل (۱۰) علیم (۱۱) [illegible] (۱۲) [illegible] کمال الدین
(۱۳) [illegible] حسن (۱۴) اسحاق (۱۵) [illegible] (۱۶) [illegible] (۱۷) [illegible]
(۱۸) ادیب (۱۹) [illegible] (۲۰) [illegible] (۲۱) [illegible] (۲۲) [illegible]
[illegible] (۱)

آپ کے کلام کے دو مجمعے تھے (۱) سرد چشم من تعلب علی (۲) اللہم اجعلنی [illegible] علی [illegible] کے ساتھ دستخط بھی کرتے تھے۔ کنیت ابو البرکات اور رکن الدین محمد لقب مفتی۔ (۲)

آپ کے جد اعلیٰ سلطان بہلول لودی (۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء - ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء) کے عہد میں ہندوستان آئے۔ نزہۃ الخواطر سے پتہ چلتا ہے کہ جد امجد مفتی رکن الدین کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ وہیں پرورش و پرداخت ہوئی۔ اپنے والد مولانا جمال الدین اور قاضی نور اللہ تستری لاہوری سے اکتساب علم کیا۔ فقہ کلام اور معقولات و منقولات میں دستگاہ حاصل کی۔ پھر اپنے والد کی جگہ پر ۹۰۰ھ/۱۴۹۴ء میں مفتی مقرر ہوئے اور تا حیات اس عہدہ پر مامور رہے۔ (۳)

مفتی جمال الدین دہلی میں احناف کے مفتی تھے۔ انھوں نے اپنے والد مفتی نصیر الدین اور بڑے بھائی مولانا عبد الغفور دہلوی ملتانی سے تحصیل علم کی۔ ان سے ان گنت اشخاص نے استفادہ کیا۔ فقہ، اصول فقہ، علم کلام اور عربی زبان میں غیر معمولی مہارت تھی۔ امراء و سلاطین وقت سے اپنے کو دور رکھتے تھے اور شب و روز درس و تدریس میں منہمک رہتے۔ شرح عقائد، شرح الوافی فقہ، اور رسالہ کی [illegible] وغیرہ کی شروح اپنی یادگار چھوڑیں۔ ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء میں ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (۴)

شیخ نصیر الدین دہلوی اپنے وقت کے مشہور علماء میں شمار کئے جاتے تھے۔ تعلیم

و تربیت اپنے والد شیخ سماء الدین سے حاصل کی۔ ان ہی سے بیعت ہوئے اور خلافت کی اجازت پائی۔ والد کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ دہلی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے (۵) سن وفات کی صراحت راقم کی نظر سے نہیں گزری۔

شیخ صدر الدین بن فخر الدین بن جمال الدین ملتانی ثم دہلوی ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ صغر سنی سے ہی تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوگئے۔ مولانا شہاب الدین ملتانی سے اکتساب علم کیا۔ سلسلہ طریقت میں شیخ کبیر الدین حسینی بخاری کے شاگرد ہوئے اور اجازت و خلافت حاصل کی۔ پھر ملتان سے تھنبور ہوتے ہوئے دہلی آئے اور وہیں مقیم ہوگئے۔ ۱۷ جمادی الاولی ۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء میں دہلی میں وفات پائی۔ حضرت فخر الدین عراقی کی "لمعات" کی ایک بسیط شرح لکھی اور شیخ عزیز نسفی کے رسائل سے اخذ کرکے "مفتاح الاسرار" مرتب کی۔ (۷)

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیخ سماء الدین ملتانی دہلوی جو مولانا تراب علی کی ساتویں پشت میں ہیں۔ ملتان کی خانہ جنگی و خلفشار کی وجہ سے وہاں سے روانہ ہوکر تھوڑے عرصہ تھنبور اور بیانہ میں رہ کر پھر سلطان بہلول لودی (۸۵۵ھ/۱۴۸۷ء) کے عہد میں دہلی آگئے۔ صاحب "نزہۃ الخواطر" کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ سماء الدین کے اخلاف دہلی سے امروہہ ضلع مرادآباد اور پھر لکھنؤ آگئے۔ اسی لیے انھوں نے شیخ فاضل علامہ تراب علی بن شجاعت علی بن فقیہ الدین بن محمد دولت بن مفتی ابو البرکات دہلوی امروہوی ثم لکھنوی لکھا ہے۔ (۸)

ولادت

۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد شیخ شجاعت علی نے سن ولادت "برخوردار" سے ۱۲۱۳ھ نکالا تھا۔ آپ کے ایک بھائی شیخ نثار علی خاں (۸ محرم ۱۳۰۱ھ/۱۸۹۳ء) بھی تھے۔ (۹)

تعلیم و تربیت

گھر کا ماحول علمی تھا۔ چنانچہ بچپن سے ہی ادب و اخلاق کی تعلیم حاصل کی۔ فقہ و اصول فقہ، اور تفسیر کا شوق گویا آبائی میراث تھا۔ اس لئے اپنے عہد کے مشاہیر اور باکمال اساتذہ سے اکتساب کیا۔ صرف و نحو کی کتابیں مولانا مخدوم حسین لکھنوی سے پڑھیں۔ منطق، فلسفہ علم کلام اور ادب کے اکتساب کے لئے مولانا مظہر علی سوداگر کے روبرو زانوئے تلمذ طے کیا، اور جملہ درسیات کی تکمیل مفتی اسمٰعیل بن وجیہ الدین مراد آبادی لندنی اور مفتی ظہور اللہ انصاری فرنگی محلی کے روبرو کی اور ان ہی سے سند فراغ حاصل کی (۱۰) صاحب تذکرہ علمائے ہند، سند فراغ کے بعد درس و تدریس کی جانب ان کے انہماک کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

فائق الاقران گشت و بہ درس و افادہ طلبہ عمر خود بسر بردہ۔ (۱۱)

اپنے معاصرین میں ممتاز ہوئے اور طالبان علم کے درس و افادہ میں اپنی پوری عمر گذار دی۔ "نزہۃ الخواطر" کے مؤلف لکھتے ہیں۔

ثم اقبل الی الدرس والافادۃ اقبالاً کلیاً (۱۲)

پھر درس و افادہ کے جانب پوری طرح سے مائل ہو گئے۔

مولانا کے فضل و کمال، ملکہ تحقیق و تدقیق اور تفقہ فی الدین کا اعتراف ان کے معاصرین و متاخرین علماء نے کیا۔ "حدائق الحنفیہ" کے مؤلف نے ان کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

"وہ یگانۂ روزگار، فاضل نامدار، جامع معقول و منقول، حاوی فروع و اصول تھے۔ (۱۳) انھوں نے کن کن مقامات پر درس و تدریس کا کام انجام دیا اس کا صحیح پتہ نہیں چلتا ہے ان کے سندیلہ ضلع ہردوئی کے سفر کے سلسلہ میں صاحب "تذکرہ" نے ان کے شاگرد حافظ شوکت علی سندیلوی (۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء)

[illegible] مکتب

جب چار سال چار ماہ چار دن کی عمر ہوئی تو ہندوستان کے مسلمان شرفا کے دستور کے مطابق بسم اللہ کی رسم ہوئی۔ سید فتح اللہ شاہ علوی اور حافظ محمد ابراہیم خیرآبادی سے کلام پاک حفظ کیا۔ اور چار سال میں اس سے فارغ ہوئے، مولوی سید فقیہ اللہ سندیلوی اور ملا امیر علی بنارسی سے کچھ استفادہ کیا۔ اس کے بعد ان کے والد چودھری مسند علی نے مشہور فاضل مولوی تراب علی بن شیخ شجاعت علی لکھنوی کو پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ نقد خوراک و پوشاک اور چند طلبہ کے صرفہ پر ان کی تعلیم کے واسطے ملازم رکھا۔ انھوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں مولوی صاحب موصوف کی خدمت میں تمام درسی کتابیں پڑھ کر سند فراغ حاصل کر لی۔

لیکن ان کے والد چودھری مسند علی ان کی تعلیم سے فراغت سے قبل ہی وفات پا گئے۔ ان کے چچا چودھری حشمت علی اور چودھری عظمت علی موجود تھے۔ جنھوں نے بڑی فراخ دلی سے تقریب فراغ میں تقریباً پندرہ ہزار روپیہ خرچ کئے (جزاھما اللہ خیر الجزا) اس تقریب میں بہت سے علمائے صلحا، طلبہ، حفاظ، اطبا، حجاج اور مشائخ حضرات مدعو کئے گئے تھے۔ صاحب ترجمہ (مولوی شوکت علی) نے نماز جمعہ کے بعد وعلّم آدم الاسماء کلھا الخ پڑھ کر وعظ بیان کیا۔ اس کے بعد الحمد شریف اور حدیث پاک إنما الاعمال بالنیات (اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہی ہے) پڑھیں۔ اس وقت موجودہ علما نے اپنے دست خاص سے ان کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی اور ان کے دونوں چچاؤں نے مولوی تراب علی کو ایک ہزار روپیہ نقد اور دو شالہ

وہ وہاں نذر کیا۔ (۱۴)

مولانا موصوف نے کاکوری کا بھی سفر کیا تھا۔ اور وہاں خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کے مشہور صوفی عالم شاہ تقی علی قلندر (۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء) سے ملاقات کر کے تبادلۂ خیالات کیا جاتا۔ صاحب "اذکار الابرار" حضرت شاہ تقی علی قلندر (۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء) کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں۔

"آپ کے اکثر معاصر علماء مولوی تراب علی لکھنوی و مفتی عنایت احمد کاکوروی (۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) وغیرہ کہا کرتے تھے کہ مولوی تقی علی علم و فضل میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے کم نہیں ہیں اگر یہ بھی کسی مشہور مقام پر ہوتے تو ان سے زائد مشہور ہو جاتے۔" (۱۵)

زیارت حرمین شریفین

سن ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں حج و زیارت حرمین شریفین کا ارادہ کیا چنانچہ ۲۲ محرم الحرام کو سندیلہ سے تیئیس آدمیوں کے ہمراہ حج کے لئے روانہ ہوئے۔ سب لوگوں کا خرچ بھی اپنے ہی ذمہ لیا۔ اثنائے راہ میں جہاں سے گزرتے وہاں کے علماء و رؤسا آپ کی جلالت علمی کی بنا پر دعوتیں کرتے اور زر نقد پیش کرتے تھے مگر کسی سے زر نقد نہیں لیا۔ اس سفر میں اس ارزانی کے دور میں آپ نے تقریباً پندرہ سولہ ہزار روپیہ خرچ کئے۔ (۱۶)

مولانا نے وہاں صرف حج و زیارت پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ وہاں کے مشہور عالم فقیہ و محدث مفتی عبداللہ سراج سے مکہ معظمہ میں حدیث شریف کا درس لیا۔ مفتی موصوف نے سند حدیث بھی عطا کی۔ (۱۷) حج و زیارت حرمین شریفین سے فراغت کے بعد واپس آئے۔ تو حافظ شوکت علی صاحب استقبال کے واسطے بڑی شان و شوکت سے کانپور گئے۔ حکیم بندہ حسن صاحب بھی لکھنؤ سے کانپور پہنچے۔ مولانا نے اپنے تمام ساتھیوں کے ہمراہ دو روز کانپور میں قیام کیا۔ پھر سندیلہ روانہ ہو گئے تاآخر

شوال ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۱ء کو سندیلہ پہنچے۔ دس بارہ میل پہلے حضرت چودھری حشمت علی صاحب شاہ رؤسا ئے سندیلہ اور کچھ سات سو اشخاص استقبال کے لئے آئے اور بڑے اعزاز و اکرام سے آپ کو سندیلہ لے گئے۔ (۱۸)

وفات

کچھ روز سندیلہ میں قیام کیا پھر لکھنؤ آکر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ رسڑہ ضلع بلیا بغرض درس و تدریس کے سلسلے میں جانا ہوا۔ وہاں پہنچ کر بخار میں مبتلا ہو گئے۔ جب بیمار نے طول پکڑا اور مقامی اطباء و معالجین کے علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو طلبہ اور خدام نے اصرار کیا کہ محمد آباد ضلع اعظم گڑھ میں ایک طبیب حاذق حکیم زین العابدین ہیں ان کا علاج ہو۔ حکیم صاحب کا علاج ہوا لیکن اس سے بھی فائدہ نہ ہوا۔ چنانچہ حاجی عبدالغفار مالک مدرسہ و رئیس رسڑہ نے ایک اور طبیب کو کسی قصبہ سے بلوایا۔ مولانا نے اس طبیب کے چہرہ کو غور سے دیکھا اور اس کے چلے جانے کے بعد کہا "یہ دوا کیا کریں گے ان کے چہرہ پر خود مردنی چھائی ہوئی ہے" باوجودیکہ اس قصبہ میں ہیضہ کا نام و نشان نہ تھا مگر اسی رات حکیم صاحب ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور صبح کو انتقال کیا۔ (۱۹)

۱۲ر صفر ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء کو حالت زیادہ نازک ہوئی۔ شب کو حالت نزع میں پانی مانگا اور پیتے ہی راہی ملک بقاء ہوئے۔ طلبہ اور دیگر اشخاص کی ایک بڑی جماعت تدفین میں شریک ہوئی مولوی محمد فصیح غازی پوری (۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء) محمد آباد سے آئے اور آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ (۲۰)

مولانا موصوف نے خود ہی اپنا مادہ سن وفات لفظ "فارغ" کہا تھا (۲۱) صاحب "تذکرہ علماء ہند" اور "نزہۃ الخواطر" نے آپ کا سن وفات یہی لکھا ہے۔ (۲۲)

• "حدائق الحنفیہ" کے مؤلف نے سن وفات ۱۲۸۰ھ اور مادہ تاریخ "زینت شبستان" درج کیے ہیں جو درست نہیں ہیں۔ (۲۳) البتہ یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ سن ۱۲۸۱ھ کے قلیل وقفہ (ڈیڑھ ماہ) کو شمار نہیں کیا ہے۔

تلامذہ

ایک عالم اور استاد کے افکار و خیالات اور نظریات و کمالات سے اس کے تلامذہ ہی پورے طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔ تلامذہ سے ہی اس کا نام باقی رہتا ہے۔ ایک شاگرد کی شخصیت کے نکھار اور اس کے کردار کی تشکیل میں اس کے اساتذہ کا بڑا کردار ہوتا ہے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد بقول صاحب "نزہۃ الخواطر" لاتعداد ہے۔ "وخلق کثیر لا یحصون بعد وعد" (۲۴) کیونکہ زمانۂ طالب علمی سے وفات تک برابر درس و تدریس میں مصروف رہے۔ بہت سے ایسے طلبہ بھی تھے جو دور دراز سے تحصیل علم کے لئے آتے اور اس کے بعد اپنے وطن واپس چلے گئے۔ مولانا ایک عرصہ تک نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ (۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء - ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء) کے حکم سے "مدرسہ شاہی" لکھنؤ میں مدرس کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ صدہا طلبہ کو درس دیا۔ سندیلہ کے قیام میں بھی متعدد افراد نے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

صاحب "شمس التواریخ" نے ایک سو چھبیس (۱۲۶) طلبہ کے نام درج کئے ہیں (۲۵) ذیل میں مختصراً چند تلامذہ کے نام اور بعد ازاں صرف پانچ ارشد تلامذہ کے مختصر سوانحی خاکے درج ہیں۔

(۱) مولوی مرزا محمد علی مجتہد مذہب اثنا عشری (۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء) (۲) حکیم عبداللہ عرف حکیم ابو کشمیری لکھنوی (۳) حکیم حسین علی لکھنوی (۴) حافظ شوکت علی سندیلوی (۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) (۵) مولوی انور علی مرادآبادی (۶) مولوی معین الدین ساکن کڑہ الہ آباد (۷) حکیم مرزا مظفر حسین خان (۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء)

شوال ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء کو سندیلہ پہنچے۔ دس بارہ میل پہلے سے چودھری حشمت علی صاحب مع رؤسا۔ سندیلہ اور چھ سات سو اشخاص استقبال کے لئے آئے اور بڑے اعزاز و اکرام سے آپ کو سندیلہ لے گئے۔ (۱۸)

وفات

کچھ روز سندیلہ میں قیام کیا پھر لکھنؤ آکر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ رسڑہ ضلع بلیا بھی درس و تدریس کے سلسلے میں جانا ہوا۔ وہاں پہنچ کر بخار میں مبتلا ہو گئے۔ جب بیماری نے طول پکڑا اور مقامی اطباء و معالجین کے علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو طلبہ اور خدام نے اصرار کیا کہ محمد آباد ضلع اعظم گڑھ میں ایک طبیب حاذق حکیم زین العابدین ہیں ان کا علاج ہو۔ حکیم صاحب کا علاج ہوا لیکن اس سے بھی فائدہ نہ ہوا۔ چنانچہ حاجی عبدالغفار مالک مدرسہ و رئیس رسڑہ نے ایک اور طبیب کو کسی قصبہ سے بلوایا۔ مولانا نے اس طبیب کے چہرہ کو غور سے دیکھا اور اس کے چلے جانے کے بعد کہا "یہ دوا کیا کریں گے ان کے چہرہ پر خود مردنی چھائی ہوئی ہے"۔ باوجودیکہ اس قصبہ میں ہیضہ کا نام و نشان نہ تھا مگر اسی رات حکیم صاحب ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور صبح کو انتقال کیا۔ (۱۹)

۱۲ر صفر ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء کو حالت زیادہ نازک ہو گئی۔ شب کو حالت نزع میں پانی مانگا اور پیتے ہی راہی ملک بقاء ہوئے۔ طلبہ اور دیگر اشخاص کی ایک بڑی جماعت تدفین میں شریک ہوئی۔ مولوی محمد فصیح غازی پوری (۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء) محمد آباد سے آئے اور آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ (۲۰)

مولانا موصوف نے خود ہی اپنا مادہ سن وفات لفظ فارغ کہا تھا (۲۱) صاحب "تذکرہ علماء ہند" اور "نزہۃ الخواطر" نے آپ کا سن وفات یہی لکھا ہے۔ (۲۲)

"حدائق الحنفیہ" کے مولف نے سن وفات ۱۲۸۰ھ اور مادہ تاریخ "زینت شبستان" درج کئے ہیں جو درست نہیں ہیں۔ (۲۳) البتہ یہ تاویل کی جا سکتی ہے کہ سن ۱۲۸۱ھ کے قلیل وقفہ (ڈیڑھ ماہ) کو شمار نہیں کیا ہے۔

تلامذہ

ایک عالم اور استاد کے افکار وخیالات اور نظریات وکمالات سے اس کے تلامذہ ہی پورے طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔ تلامذہ سے ہی اس کا نام باقی رہتا ہے۔ ایک شاگرد کی شخصیت کے نکھار اور اس کے کردار کی تشکیل میں اس کے اساتذہ کا بڑا کردار ہوتا ہے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد بقول صاحب "نزہۃ الخواطر" لاتعداد ہے۔ وخلق کثیر لا یحصون بحد وعد (۲۴) کیونکہ زمانۂ طالب علمی سے وفات تک برابر درس تدریس میں مصروف رہے۔ بہت سے ایسے طلبہ بھی تھے جو دور دراز سے تحصیل علم کی غرض سے آئے اور اس کے بعد اپنے وطن واپس چلے گئے۔ مولانا ایک عرصہ تک نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ (۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء۔ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء) کے حکم سے "مدرسہ شاہی" لکھنؤ میں مدرس کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ صدہا طلبہ کو درس دیا۔ سندیلہ کے قیام میں بھی متعدد افراد نے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

صاحب "شمس التواریخ" نے ایک سو پچیس ۱۲۵ طلبہ کے نام درج کئے ہیں (۲۵) ذیل میں مختصراً چند تلامذہ کے نام اور بعد ازاں صرف پانچ ارشد تلامذہ کے مختصر سوانحی خاکے درج ہیں۔

(۱) مولوی مرزا محمد علی مجتہد مذہب اثنا عشری (۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء) (۲) حکیم عبداللہ عرف حکیم ابو کشمیری لکھنوی (۳) حکیم حسین علی لکھنوی (۴) حافظ شوکت علی سندیلوی (۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) (۵) مولوی انور علی مراد آبادی (۶) مولوی معین الدین ساکن کڑاہ الہ آباد (۷) حکیم مرزا مظفر حسین خاں (۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء)

[illegible] مخدوم بخش [illegible] زادہ [illegible] (۱۰) [illegible] حسن [illegible]

موصوف [illegible] (۱۱) مولوی جعفر بن شاہ علی اللہ مخدوم زادہ سندیلوی (۱۳۲۱ھ/[illegible])

(۱۲) حکیم الطاف حسین خاں موہانی (۱۳) امیر حسن سہسوانی (۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء) (۱۴)

سراج احمد سہسوانی (۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء) (۱۴) مولوی شاہ عبدالسلام فتحپوری

(۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء) (۱۵) نواب محمد علی خاں رئیس لکھنؤ (۱۶) سید غنی نقی زیدپوری (۱۲۷۵ھ/

۱۸۵۸ء) (۱۷) شیخ اولاد احمد نقوی سہسوانی (۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء) (۱۸) مولوی امیر علی

مرادآبادی لکھنوی (۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) وغیرہم۔

(۱) حافظ شوکت علی سندیلوی

یہ اپنے زمانہ کے مشہور عالم تھے۔ ۹ محرم ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء کو سندیلہ میں پیدا ہوئے باوجود پیروں سے معذوری کے گھر پر کلام پاک حفظ کیا۔ مختصرات سید ظہور اللہ سندیلوی، مولوی اسرار قل بخاری سے اور مولانا تراب علی سے تمام کتب درسیہ پڑھ کر سند فراغ حاصل کی۔ فقہ، منطق، اصول فقہ اور حکمت و عربی زبان میں اپنے معاصرین میں مشہور تھے۔ کتابوں کا شوق تھا اس بنا پر ایک عمدہ کتب خانہ بھی جمع کیا تھا۔ ۸ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء کو سندیلہ میں وفات پائی۔

حاشیہ شرح جامی، الاستقصاء فی علم الاستفتاء، علم الیقین فی مسائل الاربعین، ثمرات الانظار فیما مضی من الآثار، غایۃ الادراک فی مسائل المسواک، کشف المستور من دبر المستور، افہام المسائل بجواب مائۃ مسائل وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ (۱۶)

(۲) سید غنی نقی زیدپوری

سید غنی نقوی رضوی مسلکاً شیعہ تھے۔ زید پور ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے کم عمری میں لکھنؤ آ گئے۔ مولانا تراب علی لکھنوی سے تحصیل علم کی ابتدا کی۔ [illegible]

عالم ہوگئے۔ استاد کے ہمراہ ایک طویل عرصہ لکھنؤ میں رہے۔ اس کے بعد سید حسین (م ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء) بن سید دلدار علی غفران مآب نصیرآبادی (۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء) سے فقہ پڑھی۔ عربی زبان میں شاعری بھی کرتے تھے۔ رجب ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء کو لکھنؤ میں وفات پائی۔

" رسالہ فرقیہ، شرح دعاء الصباح اور تاج اللغات " وغیرہ ان کی تصانیف ہیں (۲۷)

۳۔ شیخ اولاد احمد نقوی سہسوانی

ان کا شمار اپنے دور کے مشاہیر علماء میں ہوتا تھا۔ سہسوان میں پیدا ہوئے جب ذرا بڑے ہوئے تو تحصیل علم کے لئے رامپور گئے۔ وہاں چند درسی کتابیں مفتی شریف الدین رامپوری (م ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء) سے پڑھیں پھر لکھنؤ آئے اور بقیہ تمام کتب مولانا تراب علی اور مفتی اسمعیل لندنی (م ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء) سے پڑھیں علوم متعارفہ سے فراغت کے بعد کلام پاک حفظ کیا۔ پھر درس و تدریس کی جانب متوجہ ہوئے۔ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں پچاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

" ابتداء الصرف، مفتاح اللغات، شمس الضحی، سراج التحقیق فی شرح ضابطۃ التہذیب "، وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ (۲۸)

۴۔ امیر حسن سہسوانی

۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء کو سہسوان میں پیدا ہوئے۔ کچھ درسی کتابیں شیخ عبدالجلیل کوئلی (۱۲۷۳ھ/۱۸۲۱-۲ء) اور قاضی بشیر الدین قنوجی (م ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸-۹ء) سے اور بقیہ تمام کتابیں مفتی سعد اللہ مرادآبادی (م ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء) شیخ سراج احمد سنبھلی اور مولانا تراب علی لکھنوی سے پڑھیں۔ پھر دہلی جاکر سید

نذیر حسین حسینی (م ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) سے حدیث کا درس لیا۔ شیخ عبدالحق بن فضل اللہ نیوتنوی نے اجازت نامہ لکھ کر دیا۔ ایک عرصہ تک دہلی میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی، پھر سید امداد علی اکبرآبادی کے ہمراہ وہاں سے مرادآباد گئے جہاں انھوں نے اپنے مدرسہ میں مدرس مقرر کیا۔ کچھ عرصہ وہاں رہ کر علی گڑھ گئے اور وہیں ۱۱ر صفر ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء کو وفات پائی۔

صرف ونحو، لغت، علم کلام، اصول فقہ اور اسماء الرجال کے فنون میں بڑا ملکہ تھا۔ «طبقات الشفاء» پر تعلیقات بھی لکھیں اور اثبات حق اور رد شیعت میں دو رسائل مرتب کئے۔ (۲۹)

۵۔ مولوی انور علی مرادآبادی

یہ اپنے عہد کے مشہور عالم تھے مولانا تراب علی اور دوسرے علماء سے تحصیل علم کی۔ پھر مسیح الدولہ حکیم حسن علی خاں لکھنوی سے فن طبابت کا اکتساب کیا۔ ایک عرصہ تک لکھنو میں درس وتدریس میں مصروف رہے اس کے بعد جونپور چلے گئے۔ وہاں «مدرسہ عربیہ» میں مدرس رہے۔ پھر بھوپال گئے جہاں محکمہ قضا ان کے سپرد ہوا۔ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء کو لکھنؤ میں وفات پائی۔

قلمی نگارشات میں «انوار الحواشی، ضوء السراج، التبیان حاشیہ اوقات البحرانیہ» اور متعدد درسی کتابوں پر حواشی ہیں۔

تصانیف

مولانا تراب علی نے درس وتدریس میں انہماک کے باوجود معقولات ومنقولات میں بڑی قابل قدر کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ جو ان کے علمی تبحر اور دقیقہ رسی پر دال ہیں وہ تصنیف وتالیف کے جملہ امور خود ہی انجام دیتے تھے۔ ان کی متعدد تصانیف طبع ہو چکی ہیں۔ صاحب شمس التواریخ نے عربی و فارسی کل تصانیف اور تعلیقات وحواشی کی تعداد تیرہ بتائی

تعلیقی علی ازالۃ الدجیٰ

ان کی یہ عربی تصنیف دراصل ملا نظام الدین سہالوی (۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء) کے حاشیہ ... ازالۃ الدجیٰ پر حواشی و تعلیقات ہیں۔ ان حواشی کے سلسلہ میں راقم حروف ہیں جب میں نے ان کا مطالعہ کیا تو یہ اندازہ ہوا کہ وہ اس قدر دقیق و مشکل ہیں کہ عام طلبہ ہر استاد کی سمجھ کی چیز نہیں ہیں۔

«ورأيت قلوب الطلبة هائمة عليها وعقولهم حائرة بين يديها مع كونهم متكئين على ظواهر المطالب غير واصلين الى حقائق المآرب فهم ليسوا غائصين في بحار تحقيقها ومقتبسين لانوار تدقيقها..... فخطر ببالي ان اعلق عليها حاشية تكون كافية للمحصلين ونافعة في زمان التحصيل ووافية للمدرسين الخ۔

شارح نے ان حواشی کو سلیس و عام فہم اس طرح بنایا مثلاً انھوں نے الکتاب لکھا تو انھوں نے اس کی تشریح اس طرح کی کہ اس سے مراد قرآن ہے الحکمۃ سے مراد الشریعۃ اور یزکیھم سے مطلب ویطھرھم من العقائد الخبیثۃ والاعمال الفاسدۃ۔ الخ

یہ حواشی مولف کے عہد میں لکھنؤ کے مطبع مصطفائی سے ۱۲۵ھ میں طبع ہوئے۔

۲۔ الحاشیۃ علی شرح السلم لملا احمد اللہ سندیلوی

ملا احمد اللہ سندیلوی (۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء) نے سلم العلوم کی شرح لکھی تھی۔ اس پر مولانا نے حاشیہ لکھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ فرنگی محلی کلکشن (عربیہ ۱۱۲/۱۱۲۶)

میں بھی اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ اس کے آخر میں مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) کے دستخط بھی ہیں۔ ان کی مرقومہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ مولف مذکور کے ملاحظہ کئے ہوئے نسخہ ۱۲۶۰ھ سے انھوں نے نقل کی تھی۔ مخطوطہ ۹۸ اوراق پہ مشتمل ہے۔

۳۔ شوکۃ الحواشی لازالۃ الغواشی

مولانا کی یہ تصنیف دراصل ملا صدرالدین شیرازی کی شرح ہدایۃ الحکمۃ پر حاشیہ ہے۔ فلسفہ وحکمت میں "ہدایۃ الحکمۃ" علامہ اثیرالدین مفضل بن عمر الابہری کا تحریر کردہ متن ہے۔ جو علماء کے حلقہ میں بہت مقبول ہوا۔ اس کے متعدد شروح وحواشی لکھے گئے۔ ملا صدرالدین شیرازی کی شرح "صدرا" کے نام سے مشہور ہوئی اور درس نظامی کے درجات میں داخل رہی۔

مولانا نے ۱۲۵۳ھ میں یہ حواشی مرتب کیے اور رسالہ کی شکل میں ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں مطبع محمدی سے شائع ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سر سلیمان کلکشن ۳۲/۱۲۴ میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے جس کا سن کتابت ۱۲۵۳ھ ہے۔ گویا سن تالیف، رسالہ کی ابتدا میں مولانا سید انور علی اور احمد عثمانی کی تقاریظ بھی ہیں۔

۴۔ ہلالین شرح جلالین رباتمام بالتفسیر الغفاری بعون اللہ الباری

مولانا کی یہ تصنیف جلالین کی شرح ہے۔ اس کا سن تالیف ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء اور سن طباعت ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء (مطبع نظامی کانپور) ہے۔ یہ شرح کئی لحاظ سے اہم ومنفرد ہے۔ عام طور پر شارحین تفاسیر لکھتے وقت قرآن مجید کی آیتوں کا ذکر نہیں کرتے اور نہ ان کے حوالے دیتے ہیں۔ لیکن مولانا نے آیت بھی لکھی، جلالین کی عبارت بھی درج کی اور پھر اس کی شرح بھی کی ہے۔ تفسیر کبیر، تفسیر کشاف

اور تفسیر بیضاوی وغیرہ کے حوالے بھی مندرج ہیں۔ یہ تفسیر صرف آخری پارہ کی ہے یعنی سورۂ نبا سے سورۂ ناس تک۔ یہ تفسیر اگر مکمل ہوتی تو بڑی مفید ہوتی۔ آخری پارہ سے ابتدا غالباً اسی وجہ سے کی گئی تھی کہ اس میں چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں جو اپنے اندر ایک دریائے معانی و مطالب سموئے ہوتے ہیں۔

البیان الوافی فی شرح القاضی

قاضی محمد مبارک گوپاموی (م ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۹ء) کی "شرح السلم" پر مولانا نے "البیان الوافی" کے نام سے حاشیے و تعلیقات لکھ کر اس کو مفید عام و آسان بنایا۔ ان کی یہ تالیف ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں کانپور کے مطبع نظامی سے طبع ہوئی۔ بڑی تقطیع میں دو سو انتیس (۲۲۹) صفحات پر مشتمل ہے ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء میں مکمل ہوئی تھی چنانچہ آخر میں لکھا ہے۔ "وقد استتب شرح شرح التصورات المترجم بالبیان الوافی بعون القدیر القوی الکافی خامس المحرم سنة اربع وسبعین بعد الالف والمائتین من ھجرة سید الثقلین الخ"

دیباچہ میں سبحان اور حمد کی تحقیق ہے اس کے بعد مقدمہ میں جو ستر صفحات پر مشتمل ہے علم بداہت اور نظریت وغیرہ سے بحث کی ہے اس کے بعد چھ فصول میں مختلف نکات کے سلسلے میں بحث ہے۔

۶۔ التعلیق المرضی علی شرح القاضی

یہ کتاب بھی منطق میں "شرح قاضی" پر مفید اور سہل حواشی ہیں۔ ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں لکھنؤ سے طبع ہوئی۔ متوسط تقطیع پر پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اس تصنیف سے مؤلف کے علمی تبحر اور معلومات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔